© rasailojaraid.com

قسط:۱۶

ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

لالیاں میں احرار کانفرنس (۱۹۵۰):

۱۹۵۰ء میں چناب نگر (ربوہ) کے نزدیک لالیاں میں بھی تحفظ ختم نبوّت احرار کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پاکستان بھر سے لوگوں نے شرکت کی اور علمائے کرام نے قادیانیت کے چہرے کو بے نقاب کر کے پاکستان کے خلاف قادیانی مذموم عزائم کو منظر عام پر لا کر دین اسلام کی خدمت کا فریضہ ادا کیا۔ چنیوٹ شہر کے جیشِ احرار میں مَیں بھی شامل تھا جس نے اس کانفرنس کے تمام انتظامی امور سرانجام دیے۔ لالیاں میں مجھے امیر شریعتؒ اور قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ کے قریب بیٹھ کر اُن کی خوب صورت باتیں سننے کا اچھا موقع ملا۔ اسی موقع پر کسی تنظیمی معاملے میں امیر شریعتؒ کو قاضی صاحب کی سرزنش کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ قاضی صاحب انتہائی ادب واحترام کے ساتھ شاہ جی کی باتیں کو سر جھکا کر سنتے رہے۔ شاہ جی سے معافی کی استدعا کی جو قبول ہوئی اور پھر دونوں اس طرح ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اسی کانفرنس میں مرزا غلام نبی جانبازؒ کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ جن کی نظموں نے پورے اجلاس میں بڑا جوش وخروش پیدا کر دیا تھا۔ ہر طرف سے نعرۂ تکبیر کی صدا بلند ہوتیں اور اللہ اکبر کے الفاظ فضا میں تحلیل ہو جاتے۔ ہر شعر پر لوگ عش عش کر اٹھتے اور مرزا جانباز پر داد کے ڈونگرے برساتے۔ اُن کی نظم کا ایک شعر آج بھی میرے ذہن میں گونج رہا ہے:

میری مانو چلو منجدھار میں موجوں سے ٹکرائیں
وگرنہ دیکھنا ساحل پہ سارے ڈوب جائیں گے

مسلم ہائی سکول طارق آباد میں داخلہ (۵۰۔۱۹۴۹)

۵۰۔۱۹۴۹ء کے تعلیمی سیشن کے دوران میں نے مسلم ہائی سکول طارق آباد (فیصل آباد) میں تین سال کے تعطل کے بعد (۱۹۴۶ء میں میں نے ساتویں جماعت کا امتحان فتح پوری مسلم ہائی سکول سے پاس کر لیا تھا) آٹھویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ میں نے ان تین سالوں میں قاری مشتاق احمد صاحب سے قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا تھا اور اس کے علاوہ کئی سورتیں زبانی بھی یاد کر لی تھیں۔ قاری صاحب شہر کے واحد قاری تھے جو ہمارے جلسوں میں تلاوت کرتے تھے۔ انھوں نے ساری عمر بچوں کو قرآن مجید پڑھانے میں صرف کر دی۔ جامعہ عربیہ (جو بعد میں مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کی نگرانی میں آ گیا تھا) کی بنیاد بھی قاری مشتاق احمد صاحب نے ہی رکھی تھی۔ وہ ہمیں وہاں لے جا کر مزدوری بھی کراتے اور بتاتے تھے کہ یہاں ایک دینی مدرسہ قائم ہو گا جس کا ثواب آپ لوگوں کو بھی ہو گا۔ اسی مدرسہ میں قاری مشتاق احمد صاحب کی قبر بھی ہے۔ انتہائی مخلص، محنتی اور درد دِل رکھنے والے مسلمان تھے۔ میرے ساتھ تو خصوصی تعلق تھا۔ آج بھی اُن کے اس پیار اور محبت کی مٹھاس میری یادوں میں رس گھولتی اور دل ودماغ پر عجیب کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ سوچتا ہوں کہ کیسے کیسے لوگ تھے جو موت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا شکار ہو کر زیرِ زمیں چلے گئے۔ جن کا پل بھر کے لیے اوجھل ہونا مشکل معلوم ہوتا تھا:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بہر حال مسلم ہائی سکول طارق آباد میں داخلہ سے میری پڑھائی دوبارہ شروع ہو گئی۔ ہمیں اس طرح ایک مرتبہ پھر چنیوٹ سے فیصل آباد (تب لائل پور) آنا پڑا۔ والد صاحب تین سال متواتر کام سے الگ تھلگ رہے تو ہمارے گھر کی معاشی حالت انتہائی تشویش ناک ہو گئی تھی۔ والد صاحب نے لائل پور میں شیخ محبوب الٰہی صدر انجمن اسلامیہ سے رابطہ قائم کیا اور انھیں مسلم ہائی سکول طارق آباد میں ملازمت کی درخواست دی جو منظور کر لی گئی۔ چنانچہ انہوں نے مسلم ہائی سکول طارق آباد میں انگلش ٹیچر کی حیثیت سے دوبارہ ملازمت حاصل کر لی۔ اس سے پہلے بھی آپ مسلم ہائی سکول گجر بستی کے مڈل سکول میں اسی انجمن کے ملازم رہے تھے جس کا ذکر ابتدا میں ہو چکا ہے۔ ملازمت تو مل گئی لیکن لائل پور میں رہائش کا انتظام نہ ہو سکا۔ دوسرے تیسرے روز والد صاحب کو سائیکل کے ذریعے ہماری خبر لینے کے لیے چنیوٹ آنا پڑتا تھا۔ چند ماہ بعد وہ اسی وجہ سے پاؤں کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے۔ جس کا علاج بھی ہوتا رہا اور وہ طارق آباد سکول میں پڑھاتے بھی رہے۔ پھر اتفاقاً ان کی ملاقات شیخ عزیز احمد (مالک کالونی فلور ملز) سے ہوئی۔ شیخ صاحب کو والد محترم اُن کے بچپن میں ٹیوشن پڑھاتے رہے تھے، اس لیے وہ اُن کا بطور استاد انتہائی احترام کرتے تھے۔ شیخ صاحب نے اس ملاقات میں پوچھا کہ مجیدی صاحب آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ نے کہا کہ وہی کام جو ہمیں آتا ہے یعنی مسلم ہائی سکول طارق آباد میں پڑھا رہا ہوں۔ شیخ عزیز احمد صاحب نے کہا کہ چھوڑیے مجیدی صاحب کافی پڑھا لیا۔ اب آپ میرے پاس آیئے اور میری ملز کی دفتری ذمہ داریاں سنبھالیے۔ بطور آفس منیجر مجھے آپ جیسے دیانت دار آدمی کی انتہائی ضرورت ہے۔ میں آپ کا ممنونِ احسان ہوں گا اگر آپ میری اس خواہش کو پورا کریں اور ساتھ ہی ملز میں آپ کو رہائش کے لیے کوارٹر بھی مل جائے گا۔ اس وقت چونکہ والد صاحب کا بنیادی اور اہم مسئلہ لائل پور میں رہائش کا ہی تھا۔ اس لیے آپ نے فوراً ہامی بھر لی اور مسلم ہائی سکول طارق کی نوکری چھوڑ کر کالونی فلور ملز المعروف ''لال ملز'' میں بطور آفس منیجر کام شروع کر دیا۔ اس طرح ہم ایک مرتبہ پھر چنیوٹ سے فیصل آباد چلے آئے۔

مسلم ہائی سکول طارق آباد:

فیصل آباد میں مسلم ہائی سکول طارق آباد ایک عظیم الشان تعلیمی درس گاہ کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ اس سکول کی شہرت دور دور تک تھی۔ مسلمانوں کی واحد تعلیمی درس گاہ، جس کی قیام پاکستان سے پہلے بھی ایک منفرد و ممتاز حیثیت تھی۔ اس کا تعلیمی معیار بہت اچھا تھا اور کھیلوں کے میدان میں بھی پورے ضلع میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ ہاکی، فٹ بال، کبڈی میں تو خاص طور پر اس سکول کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ فٹ بال میں عبدالحق کا ایک نام ہے جو اسی سکول کی فٹ بال ٹیم کا کھلاڑی تھا۔ وہ بعد میں آل پاکستان فٹ بال ٹیم کا کپتان بھی رہا۔ یہاں کے کبڈی کے کھلاڑی غلام نبی ایک مدت تک سکول کی شہرت کا باعث بنے رہے۔ چودھری غلام رسول جو روم اولمپک ۱۹۶۰ء پاکستان کی فاتح ٹیم کا نائب کپتان تھا اسی سکول کی ہاکی ٹیم کا ممبر رہا اور یہیں اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے ہاکی کی تربیت حاصل کی۔غرض یہ کہ مسلم ہائی سکول طارق آباد ہر لحاظ سے خواہ تعلیم ہو یا نظم وضبط، کھیل ہو یا تربیت شہر کی ایک اہم درس گاہ تھی جس میں مجھے داخل کروا دیا گیا۔اور میرا یہ اعزاز کہ میں نے ان تمام کھلاڑیوں کے ساتھ مل کر اسی سکول میں ہاکی کے کھیل کو منظّم طور پر شروع کیا اور ہاکی میں ایک نام پیدا کیا۔ چودھری غلام رسول (جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) کے ساتھ مل کر میں نے ایک سال تک ہاکی کھیلی۔اختر رسول جس نے بعد میں پاکستان کی ہاکی ٹیم کے سنٹر ہاف کے طور پر بڑا نام پیدا کیا وہ چودھری غلام رسول کے بیٹے تھے۔وہ اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر کبھی کبھار زرعی کالج جو اس وقت یونیورسٹی نہیں تھا آیا کرتا تھا۔

سکول کی عمارت:

مسلم ہائی سکول طارق آباد کی عمارت بھی انتہائی خوب صورت اور دل کش تھی۔سکول میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا تھا کہ کسی انتہائی خوبصورت اور دل فریب علاقے میں داخل ہو گئے ہیں۔عمارت کے تین اطراف میں کھیل کے میدان سرسبز گھاس کے ساتھ ایک عجیب سماں پیدا کرتے تھے۔وسیع میدانوں کے مغربی کونے میں سکول کی عمارت اپنی آن بان شان الگ دکھاتی نظر آتی تھی۔خصوصاً ہال کمرہ کے سامنے سکول کا ''لوگراؤنڈ'' اس کے ماتھے کا جھومر تھی۔اس عمارت کو اگر دلہن سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔اسے دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جاتا۔''لوگراؤنڈ'' میں ہر قسم کے رنگا رنگ پھول دیکھنے والے کو فطری حسن کے نظارے کی دعوت دیتے۔مختلف اقسام کے پھولوں سے لدا پھدا یہ باغ اہلِ نظر کے سامنے فطرتی حسن کا دل کش منظر پیش کرتا تھا۔ ہر پھول پر تتلیوں کے جھنڈ اور بلبلوں کی آمد و رفت دیکھ کر کبھی تو غالب کے اس شعر کی طرف دھیان چلا جاتا:

بلبل کے کاروبار پر ہیں خندہ ہائے گُل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اور جب کبھی نظر تتلیوں کے پروں پر پڑتی تو تتلیوں کے مختلف رنگوں کی حسین و جمیل آمیزش سامنے آتی تو بے اختیار قدرت کی کرشمہ سازی پر رشک آتا

پھولوں کی رفاقت کا کرشمہ ہے کہ خالدؔ
ہر رنگ سجا دیکھا ہے تتلی کے پروں میں

ہیڈ ماسٹر:

ملک اللہ یار رحمۃ اللہ علیہ اس سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔انتہائی دل کش شخصیت سر پر پگڑی، چہرے پر ریش مبارک، اچکن، شلوار اُن کا مستقل لباس تھا۔لہجے میں نرمی اور دھیمے انداز میں گفتگو کرتے۔محسوس ہوتا کہ اتنا بڑا سکول یہ درویش قسم کا آدمی کیسے چلاتا ہوگا۔لیکن نظم وضبط کے معاملے میں اُن کی سختی دیکھ کر مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔نظم کے معاملے میں خواہ طالب علم ہو یا استاد کسی سے رعایت، درگزر یا لحاظ جیسے الفاظ اُن کی لغت میں نہیں تھے۔سکول کے تمام اساتذہ انتہائی قابل، محنتی اور مخلص تھے۔دو چار نام اب بھی میرے ذہن پر کندہ ہیں جنھیں شاید میں مرتے دم تک نہ بھلا سکوں: ماسٹر خادم حسین انگریزی کے استاد اور ہماری ہاکی ٹیم کے کوچ بھی تھے۔وہ ہمیشہ مسکراتے ہوئے گفتگو کرتے اور کبھی انھیں ہم نے غصے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ماسٹر یٰسین صاحب میرے کلاس انچارج تھے۔وہ خوب انگریزی پڑھاتے تھے۔ماسٹر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عطا محمد چھٹہ صاحب تاریخ کے استاد تھے۔ ایک دوسرے استاد وہ بھی عطا محمد نام کے تھے۔ انتہائی محنتی اور خوش اخلاق تھے۔ حساب اور انگریزی گرامر پڑھاتے۔ ماسٹر رحمت علی صاحب اردو فارسی کے استاد تھے۔ ان تمام اساتذہ کی اپنے پیشے کے ساتھ سچی لگن، خلوص اور محنت دیکھ کر آج برسوں بعد بھی انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مجھے ایک روحانی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ میرے یہ محسن اساتذہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے:

پڑتا ہے جونہی دل پر تیرے نقش کا پرتَو
اک چاند ابھر آتا ہے تاریک سے گھر میں

آٹھویں، نویں، دسویں تین سال کے عرصے میں اس سکول نے میری عمر کے دامن میں بہت کچھ بھر دیا۔ ایک تو مجھے یہاں باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ ہاکی کھیلنے کا موقع میسر آیا۔ میری مدتوں کی خواہش کہ مجھے ایسا ماحول مہیا ہو کہ میں باقاعدہ ایک نظم کے ساتھ ہاکی کھیل سکوں، یہاں پوری ہوئی۔ شہر میں مجھے بطور ہاکی پلیئر شہرت اس درس گاہ کی وجہ سے ملی، شہر کے اہم کھلاڑیوں سے تعارف ہوا۔ پھر میں نے اسی سکول کی طرف سے کئی دفعہ مختلف سکولوں میں ہونے والے تقریری مقابلوں میں شرکت بھی کی۔ جس کی وجہ سے میرے اندر عوام کو خطاب کرنے کے لیے اعتماد کی خوبی بھی پیدا ہوئی اور قوت گفتار و اظہار میں بھی گراں قدر اضافہ ہوا۔ میں سمجھتا ہوں تعلیمی دور میں اگر تقریر کرنے کا وصف حاصل ہو جائے تو ایک طالب علم کو ساری عمر کام دیتا رہتا ہے۔ شہر کے مشہور مقرر اقبال فیروز (ایم۔سی سکول) اور پروفیسر عبدالرحمٰن شاکر (پاکستان ماڈل سکول کے مقرر) اسی سکول ٹائم میں میرے دوست بنے۔ اسی سکول میں میری ملاقات حضرت مولانا محمد شریف جالندھری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ہوئی۔ جو میری زندگی کے اُن حضرات میں شامل ہیں جن سے میں انتہائی متاثر ہوا ہوں۔ میں نے تین سال تک ان سے دینیات پڑھی۔ شرافت کا مجسمہ، انتہائی مخلص اور وضع دار شخصیت کہ پورا شہر اُنہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ والد صاحب کے انتہائی قریبی دوستوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ والد صاحب اکثر اُن کے ہاں جاتے اور آ کر اُن کے زہد و تقویٰ کے روح افروز واقعات بیان کرتے تو ہم سب پر ایک عجیب روحانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ پھر والد محترم ان کے وسیع دسترخوان کا ذکر کرتے ہوئے ایک خاص کیفیت میں مبتلا ہو کر اُن کے گھر والوں کی تعریف بھی کرتے اور اپنے گھر والوں کو ان کی تقلید کے لیے بھی کہتے کہ مولانا شریف جالندھری صاحب نے کبھی اکیلے کھانا نہیں کھایا۔ پانچ دس آدمی جب تک ان کے گھر میں اکٹھے نہ ہو جاتے کھانے کو ہاتھ نہ لگاتے۔ لوگوں کو اپنے دسترخوان پر جمع کر کے اُنہیں کھانا کھلانا گویا اُن کی محبوب ترین عادت بن گئی تھی جو تا حیات قائم رہی۔

ان کی کلاس میں ننگے سر بیٹھنا سخت ممنوع تھا۔ بغیر سر ڈھانپے کوئی لڑکا ان کی کلاس میں بیٹھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ وہ میرے والد صاحب کے دوست تھے لیکن کلاس میں میرے لیے کوئی رعایت نہیں تھی۔ انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ میں مجلس احرارِ اسلام کا سرگرم کارکن ہوں۔ اسی لیے کبھی کبھی مجھے ”اے اوا حراری“ کہہ کے بھی بلاتے تھے انہی کی نواسی جانشین امیر شریعت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاریؒ کے عقد میں آئیں جو مدیر ”الاحرار“ سید محمد معاویہ بخاری کی والدہ ماجدہ ہیں۔ ماشاء اللہ حیات ہیں اللہ تعالیٰ انہیں تا دیر سلامت رکھے۔ والد صاحب ان دو بہنوں کو بچپن میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پڑھاتے بھی رہے ہیں دوسرے الفاظ میں والدمحترم، مولانا شریف جالندھریؒ کے گھر کے بچوں کے اتالیق بھی تھے اوران دواہم دینی گھرانوں (امیرشریعت اورمولانا شریف جالندھری) کے ملاپ کا باعث بھی والدمحترم ہی تھے کہ دونوں جانب سے ابتدائی گفتگو والدِمحترم کے ذریعے ہی ہوئی تھی۔

جھوٹ بولنے کی سزا:

یہ تین برس میں جو میرے اس سکول میں گزرے انتہائی اچھے اور ہر لحاظ سے میری ذہنی تربیت کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئے۔ کئی ایسے واقعات ہیں جو میری زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اوران کا تعلق اسی سکول کی زندگی سے ہے۔ مثلاً جھوٹ بولنے کی سزا۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ میرے ایک دوست بشیر جو میرے ساتھ ہاکی کھیلتے تھے اور شہر میں ان کی بھی بطور ہاکی پلیئر اچھی خاصی شہرت تھی۔ ہروقت ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے۔ اس سے بہت اچھا تعلق تھا۔ ایک دن میں اس کے گھر گیا جو سکول کے پاس ہی تھا۔ اس وقت وہ بڑا پریشان تھا۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ میری والدہ میوہسپتال میں داخل ہے، ان کا رسولی کا آپریشن ہونا ہے۔ دو بوتلیں خون کی درکار ہیں۔ ایک تو میں دے دوں گا دوسرے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ جس دوست سے کہتا ہوں انکار کردیتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ اس سے بڑی پریشانی کیا ہوسکتی ہے کہ کل '' آپریشن ڈے'' ہے اور آج تک خون کا انتظام نہیں ہوا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے مسکراتے ہوئے جواب دیا　کہ واہ بھائی یہ کون سی پریشانی ہے جس کے لیے تم اتنے افسردہ ہو۔ دوسرا میں جو ہوں۔ تمہارے ساتھ لاہور جا کر خون دوں گا۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی تھی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ چنانچہ دوسرے دن گھر میں یہ کہہ کر کہ میں لاہور میں ہاکی کا میچ کھیلنے جارہا ہوں، بشیر کے ساتھ لاہور خون دینے کے لیے چلا گیا۔ یہ جھوٹ اس لیے بولا کہ اگر خون کا کہا تو شاید گھر والے اجازت نہ دیں۔ لیکن مجھے پتا تھا کہ والد صاحب نے مجھے ہاکی کھیلنے سے کبھی بھی منع نہیں کیا تھا اور دوسرے شہروں میں بھی جانے کی اجازت دے دیتے تھے۔

لاہور ہسپتال پہنچ گئے۔ ایک کمرے میں مجھے لٹا دیا گیا۔　میں نے خون لینے والے سے کہا کہ ''اتنا میرے جسم میں رہنے دینا کہ واپس جاسکوں باقی تمام کا تمام نکال لو۔'' میری یہ بات سن کر وہ خوش ہوا اور کہنے لگا واہ بھائی واہ بڑے دلیر معلوم ہوتے ہو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایک بوتل خون کی دی جس کے بعد اُسی نے مجھے خاص قسم کی چائے کی پیالی اور کچھ بسکٹ کھانے کے لیے دیے جس کے بعد میں بالکل ٹھیک تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہم دونوں خون دے کر وارڈ میں بشیر کی والدہ سے بھی ملنے کے لیے گئے تو جب اسے میرے بارے میں بتایا گیا کہ میں نے ان کے آپریشن کے لیے خون دیا ہے تو اس کی والدہ نے مجھے ڈھیروں دعائیں دیں اور کہا کہ آج سے تم بھی میرے ویسے ہی بیٹے ہو جیسے کہ یہ میرا بیٹا بشیر ہے۔ اپنے بیٹے سے کہا کہ کافی سارے بادام میرے گھر میں پڑے ہیں۔ یہ میرے بیٹے شبیر کو دے دینا تا کہ اس کی توانائی بحال ہو بہر حال ہم واپس لائل پور آ گئے۔

دوسرے روز جب میں سکول گیا تو اچانک میری طبیعت خراب ہوگئی۔ کچھ غنودگی کے آثار محسوس کیے اور چند لمحوں کے لیے مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ اسی اثناء میں معاملہ ہیڈ ماسٹر کے نوٹس میں لایا گیا تو انھوں نے چپڑاسی سے کہا کہ تم شبیر کو اس کے گھر چھوڑ آؤ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب میرے والد کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور یہ نوازش فقط اسی وجہ سے تھی حالانکہ میں کہتا رہا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں اور گھر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہیڈ ماسٹر نے ایک نہ مانی اور مجھے ایک تانگے پر گھر بھیج دیا گیا۔ چپڑاسی نے مجھے چھوڑتے ہوئے، والدہ محترمہ کو بتایا کہ شبیر سکول میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ والد صاحب اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ والدہ صاحبہ نے پوچھا کہ تم اچھے بھلے صحت مند ہو، ہاکی کھیلتے ہوئے تو تم تھکتے نہیں یہ بے ہوشی والا معاملہ کیا ہے۔ میں نے والدہ محترمہ کو اصل بات بتادی کہ کل لاہور میں میچ کھیلنے کے لیے نہیں بلکہ خون دینے کے لیے گیا تھا۔ شاید اس کے اثرات تھے کہ میں صرف چند لمحوں کے لیے بے ہوش گیا تھا۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اس کے باوجود والدہ نے مجھے گرم دودھ پلا کر بستر میں سلا دیا۔ دوسرے روز جب میں ناشتہ کر کے بستہ لے کر جانے لگا تو والد جنھیں والدہ صاحبہ نے اصل بات بتادی تھی مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ ''تم سکول نہیں جاؤ گے بستہ رکھو اور گھر پر ہی رہو۔'' میں اس کی وجہ نہ جان سکا اور نہ مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ پوچھوں سکول نہ جانے کی آخر وجہ کیا ہے۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی میرے ساتھ یہی ہوا کہ مجھے سکول نہ جانے دیا گیا تو پھر میں نے ہمت کر کے والد صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ گھر پر روکنے اور سکول نہ بھیجنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا:

> ''تمہیں وجہ کا ابھی تک پتا نہیں چلا۔ جو بچہ نویں جماعت میں پڑھتا ہے، والدین کو دھوکا دیتا ہے اور گھر میں جھوٹ بولتا ہے وہ میرے نزدیک تعلیم حاصل کرنے کا سرے سے مستحق ہی نہیں۔ تمہاری تعلیم اب ختم ہو چکی ہے۔ اب تم ایک دو سال گھر پر آرام کرو۔ جسم ذرا توانا ہو گیا تو اسی ملز میں تمہیں پانڈیوں میں بھرتی کرادوں گا۔ جھوٹ بولنے والے کا تعلیم سے کیا تعلق ہے۔''

اس وارننگ سے میری حالت غیر ہو گئی کہ یہ کیا ہو گیا۔ میری آنے والی زندگی کے سارے پروگرام اندھیر ہوتے دکھائی دیے۔ میں کمرے کے کونے میں بیٹھ کر زاروقطار رونے لگا۔ اب والدہ چپ کرا رہی تھی اور میں روئے جا رہا تھا۔ والد صاحب دفتر چلے گئے۔ سارا دن پریشانی میں گزرا۔ ہاکی کا کھلاڑی بننے کا خواب بھی بکھرتا نظر آنے لگا۔ سوچتا رہا کہ اب کیسے والد صاحب کو معافی دینے پر آمادہ کیا جائے۔ اس بات پر بھی مجھے بڑا تعجب تھا کہ آخر میں نے جھوٹ بولا تو ایک اچھے کام کے لیے ہی تھا۔ ایک دوست جو کہ بہت پریشان تھا۔ اس کی والدہ کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اور یہ کوئی برا کام تو نہیں تھا۔ والد صاحب نے اس ساری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے جھوٹ بولنے کی اتنی سخت سزا کیوں دی۔ آخر انھوں نے جھوٹ کے اس اچھے پہلو کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ سمجھا تو فقط یہ کہ اچھے کام کے لیے بھی جھوٹ بولنا جھوٹ ہی ہے۔

آخر اس مشکل کا ایک ہی حل میری سمجھ میں آیا اور میں گھر والوں سے چوری اپنے سکول گیا اور ساری کہانی ہیڈ ماسٹر صاحب کو بتادی اور اُن سے درخواست کی کہ یہ بگڑا ہوا کام آپ ہی ٹھیک کروا سکتے ہیں۔ آپ میرے گھر آکر مجھے معافی دلوادیں۔ میں آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہامی بھر لی اور پھر وہ کسی فارغ وقت پر ہمارے گھر تشریف لائے۔ جہاں پر میری پیشی ہوئی اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی سفارش پر مجھے معاف کر دیا گیا اور اس طرح تقریباً ایک ہفتے کے بعد میں نے دوبارہ سکول جانا شروع کیا۔ لیکن اس سزا سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اب جھوٹ بولنا چاہوں بھی تو نہیں بول سکتا اور گر میں یہ کہوں کہ اس واقعہ کے بعد مجھے کبھی جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چک جھمرہ میں ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ اور ہماری پٹائی:

سکول سے وابستگی کا ایک اور اہم واقعہ شاید مجھے کبھی نہ بھولے۔ چک جھمرہ ہائی سکول میں ہماری لڑائی ہوئی اور یہ لڑائی خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ مجھ سمیت تین لڑکے شدید زخمی ہوئے اور ہسپتال داخل ہوئے جبکہ ایک لڑکا سکول والوں کا تھا۔ اس سال فیصل آباد ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ چک جھمرہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ ضلع بھر کے سکولوں کی تمام ٹیمیں چک جھمرہ ہائی سکول پہنچ گئیں۔ شروعات تو اچھی تھی لیکن چک جھمرہ ہائی سکول کی ساری ٹیمیں ہار گئیں۔ صرف ایک ہاکی ٹیم باقی رہ گئی تھی۔ سکول کے دیہاتی لڑکوں نے پہلے ہی سے یہ پروگرام بنالیا تھا کہ اگر ہاکی میں بھی اُن کے سکول کی ٹیم ہار گئی تو پھر ان شہری لڑکوں پر حملہ کر دو اور اس طرح وہ نقصان جو ہارنے کی وجہ سے ہوا اُس کا ازالہ ہو جائے گا۔ ہمارے کھلاڑیوں کے وہم و گمان میں بھی مخالف ٹیم کا خطرناک منصوبہ نہ تھا۔ ہم دو گول کر چکے تھے۔ تیسرے گول کے لیے بال میرے پاس تھا اور میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ تیسرا گول کر دوں۔ کیونکہ میرے سامنے فقط اُن کا گول کیپر ہی تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بال کو گول میں پھینکتا۔ مخالف ٹیم نے ہاکیوں کی مدد سے مجھے زمین پر گرا دیا اور میرے جسم پر ہاکیوں کی بارش کر دی۔ اس کے باوجود میں اٹھ کھڑا ہوا اور ایک لڑکے کے سر پر ہاکی اس زور سے ماری کہ اس کا سر شدید زخمی ہو گیا۔ اس لڑائی کی وجہ سے کھیل ختم ہو گیا۔ اب گراؤنڈ اہلِ علاقہ اور سکول کے حامیوں سے بھر چکا تھا۔ میں ان لوگوں کے گھیرے میں آچکا تھا۔ دفعتاً کسی لڑکے نے میرے سر پر بڑے زور سے ہاکی ماری۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ میرے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں بڑی مشکل سے وہاں سے بھاگ کر سکول کی کچی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ میرے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ ہمارے سکول کے پرائمری کلاس کے بچوں کو بھی بری طرح مارا گیا۔ ہمارے ایک کھلاڑی کے پیٹ میں ''جیولن تھرو'' نیزہ مارا گیا جو سیدھا اس کے دل کے قریب آ کر رکا۔ اس دوران ایک دوسرے لڑکے کو بھی بری طرح پیٹا گیا۔ سکول کے گراؤنڈ کی اس دیوار کے ساتھ تھانے کی دیوار تھی۔ ماسٹر خادم حسین جو ہمارے ہاکی کے کوچ بھی تھے اور انچارج بھی۔ انھوں نے دیوار پھلانگ کر تھانے میں اطلاع دی۔ وہاں سے فوری طور پر پولیس گراؤنڈ میں آئی۔ تب جا کر معاملہ کنٹرول میں آیا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کی بھی بے عزتی کرنے کی کوشش کی گئی لیکن شہر کے کسی آڑھتی نے اپنے پستول سے ہوائی فائر کر کے مخالفین کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔

سکول ریلوے لائن کے ساتھ تھا۔ ہم نے زخمیوں کو ہسپتال میں داخل کرایا۔ ان زخمیوں میں ہمارا ایک مخالف بھی تھا۔ رات کو یہ خبر پورے فیصل آباد میں مشہور ہو گئی۔ ہم سب کے والدین ہسپتال پہنچ گئے۔ میرے والد صاحب بھی میاں عزیز احمد کے ہمراہ اُن کی گاڑی میں میری خبر لینے آئے تو اس وقت میں بستر پر دراز چوٹ کی شدت کے مزے لوٹ رہا تھا کہ والد صاحب نے آتے ہی مجھے سب سے پہلے تو یہ کہا: ''تو نے بھی کسی کو مارا ہے کہ صرف مار کھائی ہے؟'' میں نے جواب دیا کہ یہ میرے ساتھ جو بستر پر زخمی ہے یہ میرے ہی ہاتھوں ہوا ہے۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ جوان ہو کچھ نہیں ہوا۔ جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تین دن کے بعد ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر لوٹے لیکن خالی ہاتھ نہیں بلکہ ہاکی میں ڈسٹرکٹ چیمپین ہمارے سکول کی ٹیم ہی قرار پائی۔ (جاری ہے)

© rasailojaraid.com